مُسلم معاشرہ کو تہذیبِ جدید کا چیلنج

(عبدالوہاب عزّام)

تہذیب جدید کا مقدمۃ الجیش اپنے جلو میں علوم و فنون اور فلسفہ لیے ہوئے آج سے تین سو سال قبل دنیا کے افق پر نمودار ہوُا۔ اس کے نقوش برابر اُبھرتے رہے اور اس کے خط و خال ہر لمحہ نمایاں ہوتے گئے حتیٰ کہ آخری سو برس میں یہ تہذیب اپنے پُورے شباب پر آگئی۔

یہ تہذیب اس دنیا میں اس طرح پھیلی کہ بعض طبیعتوں نے اسے خود آگے بڑھ کر قبول کیا اور بعض کو اس کے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ جب اہلِ مشرق کا اہلِ مغرب کے ساتھ میل جول بڑھا تو بعض اسلامی ممالک نے بطیبِ خاطر اس تہذیب کو اپنا لیا۔ لیکن بعض پر اسے بالجبر ٹھونسا گیا۔ مسلمانوں نے جب اس تمدن کے علمبرداروں کا اپنے ہاں اثر و نفوذ بڑھتے دیکھا تو اُن پر ایک قسم کا خوف طاری ہو گیا۔ انھوں نے یوں محسوس کیا کہ جیسے نظریات و افکار کا ایک سیلِ بے پناہ اُن کی طرف اُمڈا آرہا ہے۔ اس سیلاب کے کئی ادوار ہیں مگر اُن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔

مسلمانوں کو اس نئی تہذیب میں قوت و طاقت، علم و فن اور صنعت و حرفت نظر آئی۔ انھوں نے دیکھا اس میں ایک نظم اور ایک ضبط ہے۔ اس میں عیش و طرب کے سامان ہیں، اور یہ تہذیب حسّی لذات کے مختلف طریقوں کی نشاندہی کرتی ہے۔

مسلم قوم نے اس میں ایک ایسا نظریۂ حیات پایا جو اُن کے دین کے سراسر مخالف تھا اور اس نظریہ کی علمبردار وہ قومیں تھیں جن کے ساتھ ملتِ اسلامیہ صدیوں سے برسرِ پیکار چلی آرہی تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ اس نئی تہذیب کے پرستار مسلمانوں میں نفوذ کرتے جا رہے ہیں اور اپنے اس مسلک کی اشاعت کے لیے مختلف قسم کے دلاویز طریقے اختیار کر رہے ہیں۔

مسلمان حیران و ششدر تھے کہ وہ اس تہذیب کی یلغار کا مقابلہ کس طرح کریں۔ اُن میں اکثر ایک

مخمصے میں پڑ گئے۔ اُن کے اندر زبردست اختلاف رائے پیدا ہو گیا اور اسی اختلاف کی بنا پر وہ تین گروہوں میں بٹ گئے۔

(۱) ایک گروہ کے سامنے ان اصحابِ تمدن کی عداوت، ان کا تسلط، ان کی قہرمانیت اور ان کا ظلم و عدوان تھا۔ جو تصورات و معتقدات اور افکار و اعمال وہ اپنے ساتھ لائے تھے وہ واقعتہً یا اس گروہ کی دانست میں دینِ حق کے مخالف تھے، اس گروہ نے غم و افسوس کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ یہ دیکھا کہ اُن کا دین، ان کا اخلاق، اُن کا طرزِ معاشرت معرضِ خطر میں ہے۔ اس بنا پر یہ گروہ یورپ کی لائی تہذیب سے یکسر متنفر ہو گیا۔ خود اس سے اجتناب کیا اور لوگوں کو بھی اس سے بچنے کی تلقین کی۔

(۲) ایک دوسرے گروہ کی نظر صرف اس قوت و طاقت، علم و فن، صنعت و حرفت، اُس سیاسی و اجتماعی نظام، اُس اقتصادی خوشحالی اور سامان لہو و لعب پر تھی جو یورپ اسلامی ممالک میں لایا تھا۔ اس گروہ نے دیکھا کہ مغربی تہذیب نے اُسے بہت سے اخلاقی اور مذہبی قیود سے آزاد کر دیا ہے۔ یہ لوگ اس تمدن کے سامنے نقدِ دل و جان ہار بیٹھے اور اس پر اس حد تک فریفتہ ہوئے کہ انھوں نے اپنے آپ کو بھی یکسر فراموش کر دیا۔ ہر وہ چیز اُن کی نظر میں حقیر اور بے وقعت ہو کر رہ گئی جو انھیں اپنی تہذیب کی صورت میں ورثہ میں ملی تھی۔ وہ یورپین تمدن میں بالکل فنا ہو کر رہ گئے۔ ہر وہ چیز جو یورپ سے آئی وہ ان کے نزدیک سراپا خیر تھی اور ہر وہ بات جسے یورپ کی تائید حاصل نہ ہو سکی وہ انھیں سراسر برائی نظر آنے لگی۔ وہ یہ خیال کرنے لگے کہ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جس کی ہم حفاظت کریں۔ خوب و ناخوب کا معیار انھوں نے یورپ کو قرار دیا۔ اگر یورپ ہماری کسی بات کو پسند کرتا تو وہ بھی اُسی کی اتباع میں اسے سراہنے لگتے۔ مثلاً عربی گلکاری اہلِ یورپ کو پسند آئی اور انھوں نے اپنے گھروں کی اس سے زیبائش کی اور اسے ارابسکا (عرب کی گلکاری) کے نام سے موسوم کیا۔ انھیں کی تقلید میں مشرقی اقوام، جن میں عرب بھی شامل ہیں، اس کی مدح و ستائش کرنے لگیں۔ اگر اس گلکاری کا وہی عربی نام رہتا اور اہلِ مغرب کی نگاہ سے یہ اوجھل رہتی تو اہلِ مشرق بھی اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھتے اور نہ ہی اس سے اپنے گھروں کی آرائش کرتے۔

یورپ کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے مشرقی قوموں کو اپنے سامنے اور بھی سرنگوں کیا۔ انسانی فطرت کا

یہ خاصہ ہے کہ کمزور طبائع ہمیشہ طاقتور کی تقلید کرتی ہیں۔ اجتماعیات کا یہ ایک مسلّم اصول ہے کہ محکوم قومیں حاکم قوم کی پیروی کرتی ہیں۔

(۲) مسلمانوں کے ایک متوازن ذہن رکھنے والے اعتدال پسند گروہ نے اس معاملہ میں پورا غور و فکر کرکے اس تہذیب کو دو حصوں میں منقسم کیا۔ صنعتی تہذیب اور اخلاقی تہذیب اول الذکر کا انحصار قوانین طبیعی پر ہے جن میں مشرق و مغرب، مسلم و غیر مسلم سب متفق ہیں۔ اور جن کے بارے میں اُن کے ہاں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ اس حصے میں طب، انجینئری اور مشین سازی شامل ہیں۔ ان علوم کا اکتساب ہمیں یورپ سے ہی کرنا چاہیے بلکہ مسلمانوں کے لیے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ وہ ان کے حصول، اور اُن سے عملی فائدہ اٹھانے میں پوری پوری جد و جہد کریں۔ عقل اس حقیقت پر شاہد ہے کہ مغرب اس میدان میں ہم پر سبقت لے گیا ہے اور اُس نے سائنس کی دنیا میں محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ وہ ان علوم کے اساتذہ ہیں۔ اس لیے ان سے علوم کے سیکھنے میں ہمیں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے[1]۔

---

[1] اس ضمن میں سب سے بنیادی اور اہم بات یہ ذہن نشین رہے کہ کسی تہذیب کے علوم و فنون کو اس تہذیب کی روح سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ تسخیر کائنات کے یہ مظاہر درحقیقت کسی تمدن کے رُخ زیبا کے مختلف عکس ہوتے ہیں۔ انسانی ذہن کبھی بھی خلا میں کام نہیں کرتا۔ وہ اپنی تحقیق و جستجو کا آغاز ہمیشہ ایک عملی مفروضے سے کرتا ہے اور یہی چیز اُس کے نتائج میں بنیاد کا کام دیتی ہے۔ اُس کے ہر کام میں اُس کا بنیادی نقطۂ نظر اپنا عکس ڈالتا ہے۔ اُس کا ذہن انفعالی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ شعوری طور پر مختلف عناصر و اجزا کے امتزاج سے فطرت کا ایک مخصوص تصور قائم کرتا ہے اور اس بنا پر نہ صرف معاشرتی علوم میں بھی، بلکہ خالص وہ حقائق جن کا تعلق عالم طبیعی سے ہے، اُن میں بھی وہ ایک خاص نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے وہ تجرباتی علوم جن کا بظاہر مغرب کے فلسفۂ حیات سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا ان کے قبول کرنے میں بھی مسلم قوم کو بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ آپ مثال کے طور پر علم طبیعی کو ہی لیں۔ بادی النظر میں اس علم کا مقصد کائنات کے مختلف مظاہر کے اندر ایک یکسانیت تلاش کرکے کچھ اصول و ضوابط وضع کرنا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے یہ علم ایک مسلمان کے لیے

اس تہذیب کا دوسرا پہلو اخلاقی ہے۔ اور اگر آپ مناسب سمجھیں تو اسے انسانی تہذیب کا نام دیجیے

۴۔بھی وہی حیثیت رکھتا ہے جو اس کی ایک غیر مسلم کے لیے ہے۔ مگر دیکھیے دونوں کے تصوراتِ حیات کے اختلاف کی وجہ سے اس میں کتنا وسیع اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ مسلمانوں نے جب انفس و آفاق پر غور کیا تو انھیں اس کائنات کے اندر ایک تدبّر، ایک تنظیم نظر آئی اور اس سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ کارخانۂ قدرت محض اتفاقی طور پر معرضِ وجود میں نہیں آ گیا۔ اس کے پیچھے ایک خالق و مالک کی تدبیر کام کر رہی ہے۔ لیکن اسی کائنات کا جب ایک خدا ناشناس ذہن نے مطالعہ کیا تو اُسے یہ سب کچھ فطرت کی اندھی بہری قوتوں کی کرشمہ سازی نظر آئی۔ اس مثال میں آپ دیکھیں کہ مظاہرِ قدرت تو ایک ہیں لیکن دونوں کے نقطۂ نگاہ کے فرق کی وجہ سے دونوں نے ان سے بالکل مختلف اور متضاد نتائج اخذ کیے ہیں۔ یہی حال علم کیمیا، علم حیاتیات، علم نباتات اور علم نجوم کا ہے۔

فکر و نظر کے یہ اثرات صرف علوم پر ہی مرتب نہیں ہوتے بلکہ فنون بھی ان سے نہایت گہرے طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ یہاں یہ موقع نہیں کہ اس حقیقت کو کسی تفصیل سے سمجھایا جا سکے، لیکن اس کی وضاحت کے لیے میں صرف ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ "طب و جراحت" ایک ایسا فن ہے جس کے پیشِ نظر صرف انسانی فلاح ہے۔ لیکن اس فن نے جس تہذیب سے غذا حاصل کی ہے اور جس تمدن کی گود میں یہ پل کر جوان ہوا ہے، اُس کی روح اس کے اندر پوری طرح جاری و ساری ہے۔ چنانچہ یہ دیکھیے کہ اس فن نے جس قسم کے افراد تیار کیے ہیں، اُن کا منتہائے مقصود کیا ہے اور ان سے انسانیت کو کس قسم کے فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ پھر ان کی ادویات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کے بنانے میں اس مقصد کو ہمیشہ ذہن میں رکھا جاتا ہے کہ وہ کچھ دیر استعمال کرنے سے انسان کی فطرتِ ثانیہ بن جائیں اور پھر انسان اُن کو زندگی بھر خریدنے پر مجبور رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی تہذیب و تمدن کے بطن سے جب مختلف علوم و فنون جنم لیتے ہیں تو ان میں اس تہذیب کا بنیادی تصور خون کی طرح دوڑتا ہے۔ وہ ان میں اس طرح سمویا ہوا ہوتا ہے کہ اُسے کسی طرح بھی ہم ان سے جُدا نہیں کر سکتے۔ معاملہ پھر یہیں تک ختم نہیں ہوتا بلکہ خود ان علوم و فنون کی نوعیتیں اس قدر پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی ہوتی ہیں کہ انھیں علم کیمیا کی طرح سادہ اجزا میں تحلیل کر کے، ان کے مضرت رساں اجزا کو

تہذیب کے اس حصہ کی صورت گری تاریخ، دین، اخلاق اور آداب سے ہوتی ہے۔ اہلِ مغرب کے نزدیک

۵۔ نفع بخش اجزا سے الگ کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ قریب قریب ناممکن ہے۔

صدیوں کے انحطاط کی وجہ سے مسلمانوں میں یہ احساس اب پوری طرح پرورش پا چکا ہے کہ یہ جدید علوم و فنون جن میں اہلِ مغرب نے کمال حاصل کیا ہے وہ صرف انہیں کی سعی و جہد کا نتیجہ ہیں مگر اصل صورتِ حال یہ نہیں جو بظاہر ہمیں نظر آتی ہے۔ دنیا کی جب کوئی قوم کسی نظریہ کو اپنا کر اُسے زمان و مکان کے لوح پر ثبت کرنے کا عزم صمیم کر لیتی ہے تو پھر وہ مجبور بھی ہوتی ہے اور اُس کے دل میں یہ فطری امنگ بھی اُبھرتی ہے کہ وہ اُن تمام موانع کو دُور کرے جو اس کی راہ میں حائل ہیں اور اُن سارے وسائل کو کام میں لائے جو اس مقصد کے حصول کے لیے اس کے ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے وہ بعض قوموں کے ساتھ صلح کرتی ہے بعض کے ساتھ برسرِ پیکار ہوتی ہے۔ اسی طرح فطرت کو مسخر کر کے اپنے راستے سے قدرتی موانع ہٹاتی ہے اور پھر انہیں کی مدد سے وہ اپنے نصب العین کو غالب کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش کرتی ہے۔ یہ علوم و فنون بذاتِ خود کسی قوم کا مقصد نہیں ہوتے بلکہ مقصد کے حصول کا مؤثر ذریعہ ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی بھی جب تک اپنے دین سے وابستگی رہی اور اُس کو سربلند کرنے کا جذبہ اُن کو سرگرمِ عمل کرتا رہا انھوں نے بھی ان علوم و فنون میں محیر العقول ترقی کی۔ اب بھی اگر مسلمان اپنے نصب العین کو اپنا لیں تو یہ علوم و فنون خود بخود اُن کے ہاں پھیلنے شروع ہو جائیں گے۔ دین کو اپنائے بغیر ان کا حاصل کرنا ایک نادان بچے کے ہاتھ میں تلوار دینے کے مترادف ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر کوئی ایسی قوم جو اپنا ایک مستقل نظریۂ حیات اور تہذیب رکھتی ہو اس کے لیے کسی دوسری تہذیب سے بعض چیزوں کا بغیر ان کی روح کی تبدیلی کے اپنا لینا ہمیشہ مہلک ثابت ہوا ہے۔ اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے ایک مشہور مغربی مفکر نے لکھا ہے:

"ہر تہذیب اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہے۔ اس کے آرٹ، اس کے مذہبی احساسات، اُس کے اندازِ زیست، اُس کے معاشی اور صنعتی کمالات کے درمیان ایک فطری ربط پایا جاتا ہے۔ مجھے اس امر میں شک ہے کہ ایک تہذیب بھی کسی دوسری تہذیب سے کچھ اخذ کر سکتی ہے مثلاً کیا اہلِ مشرق یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم مغرب سے جنگی جہاز، اُس کی صنعتیں اور کارخانے، اُس کا ہم

اس میں کچھ خوبیاں اور کچھ برائیاں بھی ہیں، اس میں ہدایت کے ساتھ گمراہی ہے۔ اس کی اچھائی میں بہت سے عناصر شر کے بھی شامل ہو گئے ہیں۔ اور اس کے محاسن کو بہت سی قباحتوں نے بگاڑ دیا ہے۔ اس تہذیب کو صنعتی تہذیب پر قیاس نہیں کرنا چاہیے اور ہمارے لیے کسی طرح بھی جائز نہیں کہ ہم اس حصے کو اخذ کریں۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کی راہ زیادہ سیدھی اور صاف ہے اور اُن کا طریقہ زیادہ صحیح اور بہتر ہے۔ لہٰذا ہمارے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ ہم رشد و ہدایت کے معاملہ میں مغرب کی پیروی کریں بلکہ ہم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنی قیمتی میراث کی پوری قوت اور طاقت سے حفاظت کریں، اسے اپنے سینے سے لگائیں اور اُن اقدارِ حیات کی قدر و قیمت پہچانیں، جو ہمیں اس کے ذریعہ ملی ہیں۔

یہ اعتدال پسند گروہ اپنے مسلمان بھائیوں سے کہتا ہے: دیکھنا کہیں اس تہذیب کی ظاہری آب تاب تمھیں مرعوب نہ کر دے، اُس کا مکر و فریب تمھیں دھوکا نہ دے دے، اس کی حسی لذات کہیں تمہیں مفتون نہ کر لیں، اس کا بھڑکیلا پن کہیں تمھاری آنکھوں کو خیرہ نہ کر دے اور اس کی گھن گرج کہیں تمہیں جادۂ مستقیم سے بھٹکا نہ دے۔ تم یہ گمان نہ کرو کہ جس نے علم و فن میں ترقی کی ہے، جس نے زیادہ مال و اسباب جمع کیا ہے وہ افکار و معتقدات، سیرت و کردار اور اخلاق و آداب کے لحاظ سے بھی افضل ہے۔ اپنی قدر پہچانو، اور اُن اخلاقی محاسن اور انسانی فضائل کی قدر کرنا سیکھو، جن کے تم وارث ہو۔

---

۲۲ علمِ طب تو درآمد کریں گے مگر ہم وہاں کے معاشرتی انتشار، سرعت اور قنوطیت اور اسی طرح کی دوسری قباحتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیں گے۔ اسی طرح مجھے اس بات کے ماننے میں بھی تردد ہے کہ اہلِ مغرب کبھی پوری ہوشمندی سے یہ کہہ سکتے ہیں "ہم مشرق سے اس کی مذہبیت کو تو لے لیں گے مگر ہم اپنے مادی علوم و فنون کو اس پر ہمیشہ فائق رکھیں گے۔"

(ترجمان القرآن)

پھر یہ متوازن ذہن رکھنے والا طبقہ مسلمانوں کی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہوئے ان سے پورے زور کے ساتھ یہ کہتا ہے: مسلمانوں نے سیاسی آزادی کے حصول کے لیے پوری پوری کوشش کی ہے مگر اس سے زیادہ اہم اور اثرات کے اعتبار سے زیادہ دُور رس وہ جدوجہد ہے جو انھیں ذہنی غلامی سے نجات دلانے کے لیے کرنی چاہیے۔ تمھیں اپنی صلاحیتوں کو جانچنا اور اپنی عقل و فکر کی قوتوں کو اُجاگر کرنا چاہیے تاکہ وہ اس قابل ہوں کہ اس تہذیب کی خوبیوں کو اختیار اور اس کی مضرتوں کو ترک کرسکیں، تاکہ وہ خبیث و طیب کے درمیان امتیاز کرسکیں، تاکہ وہ ایک آزاد، مختار، صائب الرائے انسان کی طرح کھرے اور کھوٹے کے درمیان حدِ فاصل کھینچ سکیں۔ اس انسان کی طرح جو حلال و حرام کے درمیان اپنی عقل اور علم سے تمیز کرتا ہے۔ وہ غیروں کی عقل اور غیروں کے علم سے یہ کام سرانجام نہیں دیتا۔

ہمیں اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں کہ اس تہذیبِ جدید میں علمی اور صنعتی اعتبار سے انسانیت کو کئی ایک فوائد[1] بھی حاصل ہوئے۔ ہمیں اس سے بھی انکار نہیں کہ علمی اور صنعتی کمالات کے علاوہ سیاسی اور اجتماعی امور میں بھی اس میں کئی پہلو خیر کے بھی ہیں لیکن یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ دینی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے اس کی مضرتیں بہت زیادہ ہیں اور اس نے انسانیت کے اندر ایک عظیم فساد اور اختلال پیدا کیا ہے۔ اس تہذیب نے ثابت کر دیا ہے کہ صنعتی اور علمی ترقی اخلاقی نشوونما

---

[1] یہ بات بھی محلِ نظر ہے کہ کیا واقعی نئی تہذیب علمی اور صنعتی اعتبار سے انسانیت کے لیے فائدہ بخش ثابت ہوتی ہے۔ جب ہم بڑے بڑے کارخانوں، رواں دواں کاروں اور عظیم الشان محلات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں احساس گزرتا ہے کہ شاید انسانیت نے ترقی کی ہے۔ لیکن جب ہم اُس تباہی پر غور کرتے ہیں جو پہلی اور دوسری عالمگیر جنگیں انسانیت پر لا چکی ہیں، جب ہم فراوانی کے اس دَور میں انسان کی بدحالی پر نگاہ ڈالتے ہیں جب ہم اُس انتشار کا تصور کرتے ہیں جس سے انسانیت اس وقت دوچار ہے تو ہم پھر ایک گہری سوچ میں پڑ جاتے ہیں اور موازنہ کرنے لگتے ہیں کہ انسانیت نے اس تہذیب میں کیا کھویا اور کیا پایا ہے۔ اس تہذیب کا سب سے افسوسناک پہلو یہی ہے کہ جس انسانیت کے لیے یہ علمی اور صنعتی ترقی کی گئی ہے اُس انسانیت کو ہی اس تہذیب کے اعیان نے داؤں پر لگا دیا ہے۔ (ترجمان القرآن)

کی ضامن نہیں ہو سکتیں۔

ہمیں یہ دیکھ کر انتہائی دکھ ہوتا ہے کہ اس تہذیب میں شر نے خیر کے ساتھ مل کر اس کو بھی شر بنا دیا ہے، اس کی برائیوں نے اس کی خوبیوں اور اچھائیوں کو بھی مسخ کر دیا ہے، اس کے آلام و مصائب نے اس کی راحتوں کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ ہم حسرت بھری نگاہوں سے یہ دیکھتے ہیں کہ اس تہذیب کا دل و دماغ ایک دوسرے کے ہم رکاب نہیں۔ اس میں ایمان و ایقان، خیالات و افکار کی حفاظت اور پاسبانی نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے ایک مستقل بے چینی اور دائمی اضطراب ہے۔ جو اس آیۂ کریمہ کا مصداق ہے:

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ۔

کہہ دو کہ وہ اس بات پر قادر ہے کہ تمھارے اوپر سے یا تمھارے پیروں تلے سے کوئی عذاب لا کھڑا کر دے یا تمھاری جماعت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے تمھیں ایک دوسرے سے لڑا دے اور اس طرح تمھیں ایک دوسرے کے ہاتھوں جنگ کا مزہ چکھا دے۔

اس وقت ہمارا یہ مقصد نہیں کہ ہم تہذیبِ حاضر کے محاسن گنوائیں اور اس بات کا جائزہ لیں کہ نوعِ انسانی کو اس تہذیب و تمدن سے کیا کیا فوائد حاصل ہوئے ہم یہاں اپنی بحث کو صرف اسی حد تک محدود رکھتے ہیں جہاں تک ملتِ اسلامیہ کو اس تہذیب کے افکار و نظریات سے خطرہ لاحق ہے۔ اس کے بیان میں بھی ہم اختصار سے کام لیتے ہیں اور صرف ضروری اور اہم امور کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں۔

اس بدیہی حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ تہذیبِ نو پر الحاد و مادیت پوری طرح مسلط ہے اور اس کا تانا بانا حسّی لذات کے دلفریب تاروں سے تیار کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے لیے اس تہذیب کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس پر الحاد اور زندقہ چھایا ہوا ہے اور مادیت غالب ہے۔ ملتِ اسلامیہ بحیثیت ایک جماعت کے دین کی حامل ہے، اُس کا خدا پر ایمان و ایقان ہے اور اسی

کی محبت سے اُس کا دل سرشار ہے۔ اُس کی رضا جوئی اُس کی زندگی کی غایت الغایات ہے، وہی اس کا مبتدا اور منتہا ہے۔ اُس کے افکار و اعمال، نظریات و معتقدات سب اسی ایک محور پر گھومتے ہیں۔ اسی کا عطا کردہ ایک ضابطۂ حیات ہے، جس نے مسلمانوں کو ایک منظم جماعت بنا دیا ہے؛ جس نے اُن کے مختلف داعیات اور رجحانات کے مابین ایک وحدت اور ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ ایک شرعی نظام ان کی شیرازہ بندی کرتا ہے، اور ایک ایسا ایمان اُن کی پشت پناہی کرتا ہے جو زمان و مکان یا احوال و ظروف کی حد بندیوں سے بلند و بالا ہے۔

نفس تنہا تو بھٹکے ہوئے میلانات رکھتا ہے جن کی کوئی حد نہیں ہے۔ لیکن یہی نفس اگر حق سے وابستہ ہو جائے تو شریعت کے نظام کو قبول کر لیتا ہے، اور یہی نفس جب حق تعالیٰ سے تعلق پیدا کرے، تو علم اور دوام حاصل کرتا ہے[1]۔

مومن کی شان ایک مومن و مسلم خدا پر پختہ ایمان رکھتا ہے، اور بلا واسطہ اس سے رابطہ پیدا کرتا ہے۔ اُسی کی رضا اُس کے نزدیک زندگی کی منزلِ مقصود ہے۔ اور وہ ہر لمحہ اس امر کے لیے کوشاں رہتا ہے کہ اپنے آپ کو صفاتِ الٰہی سے متصف کرے۔ مادی دنیا اُس کے نزدیک بالکل حقیر اور بے وزن ہے۔ وہ اس سے بلا شبہ فائدہ اٹھانے کے جد و جہد کرتا ہے، مگر اسی کو منتہائے مقصود خیال نہیں کرتا۔ وہ اپنی تگ و تاز میں مادی دنیا کو بہت پیچھے چھوڑ جاتا ہے اور اُس روحانی دنیا کی تلاش کرتا ہے جو بے پایاں و بے کنار ہے۔ اُس کے عقائد و نظریات نہ تو حسی دنیا تک محدود رہتے ہیں اور نہ ہی یہ مادی دنیا اُن کے لیے بنیادیں فراہم کرتی ہے۔ وہ دنیا کا آقا ہوتا ہے اور اس کا محکوم بن کر نہیں رہتا۔ دنیا اس کی گرفت میں ہوتی ہے، مگر اُس کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں نہیں ہوتی۔ وہ متاعِ دنیا سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے، لیکن نہ تو اس سے مرعوب ہوتا ہے اور نہ ہی مغلوب۔ وہ اس کی محبت میں اپنے آپ کو گرفتار نہیں کرتا بلکہ اُس کو اپنا مطیع اور فرمانبردار بناتا ہے اور اپنی اخلاقی برتری اور دینی قوت کے سہارے انھیں مسخر کرتا ہے۔ وہ اُس سے صرف اسی قدر استفادہ کرتا ہے جتنا کہ دین اور اخلاق اُسے اجازت دیتے ہیں۔ وہ ایک ضابطۂ قانون کے مطابق اس میں جد و جہد

[1] دیوان الثانی

کرتا ہے ۔ وہ ہمیشہ صراطِ مستقیم پر گامزن رہتا ہے ۔ اس کا دستورِ حیات یہ نہیں کہ جس چیز کو چاہا، حق قرار دے دیا اور جس کو چاہا باطل ٹھہرا دیا، بلکہ اُس کا طرزِ عمل یہ ہے کہ جسے شریعت نے حلال کہا ہے وہ اُس کے نزدیک حلال ہے، اور جسے شریعت نے حرام قرار دیا ہے وہ اس کی نگاہ میں حرام ہے ۔ جو کام انسانی عزوشرف کے شایانِ شان ہیں وہ جائز اور جو اس کے خلاف ہیں وہ اس کے نزدیک ناجائز ہیں۔

وہ اس سرزمین میں اپنے آپ کو خدا کا نائب اور خلیفہ سمجھتا ہے جس کا مقصد وحید اس کے بندوں کے درمیان عدل وانصاف قائم کرنا ہے ۔ وہ خدا کی سرزمین کو نہ صرف آباد کرتا ہے بلکہ اس میں اصلاح بھی کرتا ہے ۔ وہ ہمیشہ حق پر قائم رہتا ہے ۔ وہ اپنی ذات میں بڑا ہمدرد اور ایثار کرنے والا ہوتا ہے ۔ وہ راہِ حق کا سپاہی ہے اور خیر اور بھلائی کی طرف اس جذب وشوق، اشتیاق اور ولولہ سے دعوت دیتا ہے جیسے کہ پوری انسانیت کے متعلق صرف اُسی سے بازپرس ہونے والی ہے ۔ وہ دنیا اور اُس کے متعلقات سے بے تعلق، برائیوں سے اجتناب کرنے والا، اور برائیوں کے خلاف سرکش ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ وہ بڑا ہی کریم النفس اور شفیق بھی ہے ۔ تعلق باللہ اُس میں قوت وطاقت پیدا کرتا ہے ۔ اُسے ہر چیز سے بے نیاز بنا دیتا ہے اور اُس پر کبھی مایوسی طاری نہیں ہوتی ۔ رحمت باری سے گم کردہ راہ کے علاوہ اور کون مایوس ہو سکتا ہے ۔ وہ ہمیشہ سرگرمِ عمل رہتا ہے ۔ ناکام ہونے کے باوجود کامیابی کی کوشش میں ہمت آزما رہتا ہے ۔ اس کے پائے ثبات میں کبھی تزلزل نہیں آتا ۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ ہر سختی کے بعد راحت ضرور آتی ہے اور ہر تنگی کے بعد کشائش بالیقین ظاہر ہو کر رہے گی ۔ دنیاوی مصائب وآلام اگر اُس پر یکبارگی یلغار کر دیں تو وہ اپنے آپ کو ہلاک نہیں کرتا ۔ اس کا ایمان دنیا کی مسرتوں اور دکھوں سے بالاتر ہے ۔ اُس کا نفس دنیا اور اُس کے تلخ وشیریں تجربات سے اعلیٰ اور ارفع ہے اور اُس کی ہمت اس کے رنج وراحت سے بالکل متاثر نہیں ہوتی ۔

امتِ مسلمہ جو ایمان کی ان بنیادوں پر قائم ہے ان صفات سے متصف ہے ، وہ جب یہ دیکھتی ہے کہ اس کے ہر فرد پر اس تہذیب الحاد اس حسی تمدن کے اثرات بڑھتے جا رہے ہیں تو وہ خوف زدہ ہو جاتی ہے ۔ وہ اس تہذیب کی آغوش میں پل کر جوان ہونے والے افراد کو خود غرض اور دنیاوی فوائد ولذائذ کا غلام

پاتی ہے۔ وہ یہ دیکھتی ہے کہ ان لوگوں کے سارے افکار و نظریات، احساسات و رجحانات اسی عالم مادّی کے خمیر سے تیار کیے گئے ہیں اس لیے اس تہذیب کے پرستار نے اس سے آگے نہ تو کبھی کچھ دیکھا اور سوچا ہے، اور نہ ہی اس سلسلہ میں کوئی ایسی کوشش کی ہے۔ اسی کی سعی و جہد کا ہدف صرف مادّی فوائد کا حصول ہے۔ اور وہ جب اس مقصد تک پہنچنے کے لیے راہیں مسدود پاتا ہے تو پھر جائز ناجائز، حلال و حرام، خبیث و طیب کے سارے امتیازات یک قلم ختم کر کے آگے بڑھتا ہے لیکن اگر اس میں کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکے، تو جان تک کو بھی ختم کرنے سے گریز نہیں کرتا کیونکہ اس کی زندگی سراسر مادّی ہے، اور جب اُسے مادّی آسائش اور لذتیں حاصل نہ ہوں تو آخر اس زندگی کا کیا فائدہ؟

زر و مال اس کا کعبۂ مقصود ہے، جس کے کمانے اور جمع کرنے میں وہ ہر خسّت و رذالت کو گوارا کر لیتا ہے۔ یہ قحبہ خانے، یہ عیاشی اور بدکاری کے اڈے، جو دن رات آباد رہتے ہیں اور انسانوں کو منکرات پر اُبھارتے ہیں۔ جن کے ذریعے اہلِ مغرب شہوانی فوائد و لذائذ حاصل کرتے ہیں ـــ یہ سب مال و شہوات کی پرستش کے مختلف مظاہر ہیں اور دین و اخلاق کی توہین کی مختلف صورتیں۔

مسلمان عورت مسلمان عورت گھر کی مالکہ، نیک بخت بیوی، شفیق ماں، پاک دامن خاتون، ہر قسم کی دنائت و ذلت سے گریز کرنے والی ہے۔ اسلام اس کی عزت و ناموس کا محافظ اور اُس کے حقوق کا پاسبان ہے مگر اسلام اسے اپنی اور اپنے گھر کی دیکھ بھال کا ذمّہ دار بھی ٹھہراتا ہے۔ مسلمان اس تہذیب جدید کے فتنوں سے خائف ہیں اور انہیں اس بات کا ہر وقت خطرہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں یہ تمدن اُسے راہِ راست سے بھٹکا نہ دے۔ نئی تہذیب عورت کو گھر کی چار دیواری سے نکال کر باہر لے آئی ہے، اُسے خاوند سے سرکشی پر آمادہ کیا ہے، اسے اولاد سے بیزار کیا ہے۔ اُس کی مصروفیت اب بازاروں، صنعت گاہوں، جلسوں اور محفلوں میں اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ گھر سے باہر ہی گزارتی ہے اور جب کبھی گھر میں داخل بھی ہوتی ہے تو ان مجالس میں شرکت کے لیے اپنی زیب و زینت میں لگی رہتی ہے۔ اُس نے اولاد کو کھو دیا ہے اور خاندانی روابط کو توڑ دیا ہے۔ اس تہذیب جدید نے عورت کو یہ سارے فریب حریّت اور مساوات کے نام پر دیئے ہیں۔ اور اس بچاری

پر اُن صعوبتوں کو لاد دیا ہے جس کے لیے وہ درحقیقت پیدا نہیں کی گئی اور نہ ہی وہ انھیں اٹھانے کی سکت رکھتی ہے۔ زمین و آسمان کا تفاوت ہے اُس عورت کی زندگی میں جو بازاروں میں ماری ماری پھرتی ہے، اور اُس عفیفہ میں جو گھر کی مالکہ ہے۔

تہذیبِ جدید چاہتی ہے کہ عورت راہ چلتے نظر بازوں کے لیے اپنی ذات کے اندر سامانِ تسکین فراہم کرے اور وہ بازاری قسم کے لوگوں کی نگاہوں کا ہدف بنے۔ وہ لوگ اس کے جسم سے دن رات تجارت کرتے ہیں اور اسی کے دم قدم سے آج عشرت کدے اور قحبہ خانے آباد ہیں۔ یہ بیچاری اس تہذیب کے ہاتھوں ایک کھلونا بن کر رہ گئی ہے۔ اس کی حیثیت محض ایک نفع بخش کاروبار کی سی ہے۔

مسلمان اس بات کے آرزو مند ہیں کہ عورت کی آبرو، اس کی عزت و ناموس کی حفاظت کی جائے وہ گھر میں رہ کر اپنے رفیقِ حیات کے لیے راحت و آرام کا باعث بنے، اپنی اولاد کی اچھی تربیت کرے۔ مسلمان اس صنفِ نازک کو مغربی تہذیب کے لائے ہوئے مصائب سے بچانا چاہتے ہیں اور وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ وبا اُس کے ہاں پھیل کر اُس کو بھی تباہ نہ کر دے۔

مسلمان خاندان | مسلمان خاندان ایثار و محبت، اطاعت و فرمانبرداری، نیکی اور حسنِ سلوک کے لطیف اور پاکیزہ احساسات سے تشکیل پاتا ہے۔ ہم آج تک کسی ایسے قانون، ضابطۂ حیات یا مذہب سے آشنا نہیں ہوئے جس نے والدین کے عزت و احترام کو وہ بلند مقام بخشا ہو، جو اسلام نے انھیں عطا کیا ہے۔ قرآنِ حکیم نے ان کا مرتبہ اتنا زیادہ بڑھا دیا ہے کہ اُن کے ساتھ نیکی اور اچھے برتاؤ کا ذکر خدا کی توحید اور عبادت کے ساتھ ساتھ کیا ہے[1]۔ اللہ تعالیٰ ہر حالت میں اُن کے ساتھ حسنِ سلوک کی تلقین

لـه وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا ٱللَّهَ وَبِٱلْوَٰلِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْيَتَٰمَىٰ وَٱلْمَسَٰكِينِ وَقُولُوا۟ لِلنَّاسِ حُسْنًا۔ (البقرہ - ۱۰)	یاد کرو جب ہم نے اسرائیل کی اولاد سے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا ماں باپ کے ساتھ، عزیز و اقارب کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا اور لوگوں سے بھلی بات کہنا۔
وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوٓا۟ إِلَّآ إِيَّاهُ	فیصلہ کر دیا تیرے رب نے کہ تم کسی کی عبادت نہ کرو

کرتا ہے۔ ہاں اگر وہ مشرک ہوں اور اپنے بچے کو شرک کا حکم دیں تو اس بارے میں اُن کی بات نہیں ماننی چاہیے لیکن اور معاملات میں اُن سے نہایت ادب سے پیش آنا چاہیے۔[۱۱]

اسلام نے ماں کی عزت و توقیر اور پاس و لحاظ کو باپ سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس لیے کہ ماں بچہ کو جنم دینے میں سخت دکھ جھیلتی ہے، اُسے دودھ پلاتی ہے۔ اپنی آغوش میں پالتی ہے اور اس پرورش میں بڑے مصائب برداشت کرتی ہے۔ اسی بنا پر اسلام نے بتایا ہے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔

اسلام نے قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کی بھی بڑی تاکید کی ہے اور اُن کے حقوق کو حقوق الٰہی کے

۹ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۔ إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا (بنی اسرائیل ۲)

مگر صرف اس کی۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس اُن میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچیں تو انہیں اُف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ اُن سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ اُن کے سامنے جھک کر رہو۔ اور دعا کرو کہ پروردگار ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔

۱۰ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۔ (العنکبوت ۱)

اور ہم نے تاکید کی انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی۔ لیکن اگر وہ تجھے شرک پر مجبور کریں جس کی تم کو خبر نہیں تو اُن کا کہا مت مانو۔

۱۱ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۔ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ۔ وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ (لقمٰن ۲)

اور ہم نے والدین کے بارے میں انسان کو تاکید کردی۔ اس کی ماں نے تھک تھک کر اُسے پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اُس کا دودھ چھڑایا۔ حق مان میرا اور اپنے ماں باپ کا۔ آخر مجھی تک آنا ہے لیکن اگر وہ دونوں تجھے شرک پر مجبور کریں تو اُن کا کہنا مت مانو مگر دنیا کے دستور کے مطابق اُن سے حسن سلوک کر، اور اس کی اتباع کر جس نے میری طرف رجوع کیا۔

ساتھ بیان فرمایا ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَاءَلُوْنَ بِہٖ وَ الْاَرْحَامَ۔ جس خدا کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اس کا اور قرابت داروں کا پاس ملحوظ رکھو۔

مسلمان گھرانا ایک پاکیزہ گھرانا ہے۔ جس میں ایک دوسرے سے محبت اور باہمی تعاون بطور بنیاد کام دیتے ہیں، جس میں والدین کا احترام اور بھائیوں سے مروت ہوتی ہے۔ چھوٹے بڑوں کی اطاعت کرتے ہیں۔ تہذیب جدید کے لائے ہوئے افکار و نظریات اس عائلی نظام کے لیے ایک زبردست چیلنج ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ محبت و اخوت کے ان مقدس رشتوں کو توڑ کر اسلامی گھرانے کا شیرازہ بکھیر دیا جائے تاکہ بغاوت، سرکشی اور نافرمانی کی آندھیاں ان افراد کو پھر جہاں چاہیں اڑا کر لے جائیں۔ گھر بے آباد ہوں اور ان کی جگہ ساری رونق شراب کی محفلوں ہوٹلوں اور کلبوں میں سمٹ جائے نہ والدین کا احتساب باقی رہے، نہ بزرگوں کا احترام اور نہ بچوں پر شفقت[1]

[1] صاحب مقالہ نے جس وقت نظر سے اس پریشان کن صورت حال کا مطالعہ کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ تہذیب جدید نے یوں تو زندگی کے سب شعبوں میں ایک زبردست بگاڑ پیدا کیا ہے لیکن اس نے جس طریقہ سے خاندانی نظام کو درہم برہم کیا ہے وہ حد درجہ تشویشناک ہے۔ اس کے زہریلے اثرات اب یہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ خود اہل مغرب بھی چلا اٹھے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں سوسائٹی پر بہت سی کتابیں ایسی شائع ہوئی ہیں جن میں ان چیزوں کا رونا رویا گیا ہے۔ ہم ذیل میں صرف چند اقتباسات نقل کرتے ہیں۔

"انسان محض حیاتیاتی وجود ہی نہیں رکھتا جس کا اپنا کوئی نظریہ نہ ہو، بلکہ وہ بہت سے ایسے احساسات و رجحانات رکھتا ہے جو صحیح نشو و نما کے محتاج ہوتے ہیں۔ اس فرض کو ماضی میں خاندان سرانجام دیتا تھا۔ لیکن آج کل خاندان اس اہم فرض کی بجا آوری میں مجرمانہ غفلت برت رہا ہے۔ اس کوتاہی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ایک ایسا خاندان جس میں خاوند اور بیوی کے تعلقات کسی مضبوط بنیاد پر استوار نہ ہوں وہاں بچوں کی صحیح طور پر تربیت نہیں ہو سکتی۔ جس کی وجہ سے بچوں میں اوصاف حمیدہ پیدا ہونے کی بجائے بہت سی اخلاقی کمزوریاں ابھر آتی ہیں۔ ایسے خاندانوں میں پرورش پانے والے بچے بالعموم کم ظرف، تخریب پسند اور منافق ہوتے ہیں۔ اگر تعلیمی ادارے تربیت کی اس کمی کو کسی حد تک پورا کر سکتے ہیں

میں دیکھتا ہوں کہ اسلامی معاشرہ میں اس تہذیب کی وجہ سے بڑا اختلال اور فساد پیدا ہو گیا ہے۔

۵۔ تو پھر بھی کوئی بڑی بات نہ تھی، مگر وہ ایسا نہیں کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ان پڑھ ماں جس میں ذہانت موجود ہو، وہ ان سکولوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ کے مقابلہ میں بہتر معلمہ اخلاق ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ اب مجرموں اور فساق و فجار کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اب دنیا میں ایسے افراد پیدا ہو رہے ہیں جو نہ تو کسی مضبوط سیرت کے مالک ہیں اور نہ ہی انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے۔" SOROKIN THE CRISIS OF OUR AGE

"موجودہ سماج نے سب سے زیادہ فاش غلطی یہ کی ہے کہ اس نے تربیت کے لیے خاندان کے مقابلہ میں مدرسوں پر اعتماد کیا ہے۔ آج کی ماں اپنے بچے کو نرسری سکول میں صرف اس لیے چھوڑ آتی ہے تاکہ وہ اپنی معاش کے لیے آزاد شہوت رانی کے لیے فضول قسم کی آرٹ پرستی کے لیے اور برج کھیلنے یا سینما جانے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت بچا سکے اور اس طرح ایک قسم کی فضول بیکاری (BUSY IDLENESS) میں منہمک رہے۔ اس طرز زندگی نے خاندانی نظام کو، جس کے زیر اثر رہ کر بچہ بہت کچھ سیکھتا تھا، بالکل درہم برہم کر دیا ہے۔ ایک بچہ اپنی ذہنی اور عملی صلاحیتوں کو ماحول کی مدد سے ہی صحیح طور پر نشو و نما دے سکتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی حد تک الگ تھلگ بھی رہے مگر خاندان کے افراد کی توجہ کا مرکز بھی ہو۔" (ALEXIS CARREL: MAN THE UNKNOWN)

"ایک ایسی سوسائٹی جو بنیادی طور پر صنعتی ہے اور جس کی تنظیم بڑی تیز رفتاری کے ساتھ خالص میکانکی خطوط پر کی جا رہی ہے، ایک فرد کا اپنے باپ کے ساتھ برتاؤ کوئی معاشرتی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ میں باپ کا اپنے بیٹے پر اقتدار ہر آن کم ہو رہا ہے۔ اور اسی طرح بیٹے کے دل میں اپنے باپ کی طرف سے عزت و احترام کا جذبہ روبہ زوال ہے۔ ان کے باہمی تعلقات تیزی کے ساتھ قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں اور عملاً ایک ایسی سوسائٹی کے ذریعہ ان تعلقات کا خون ہو رہا ہے جس میں افراد کے باہمی حقوق کے منسوخ کر دینے کا رجحان پایا جاتا ہے اور جس کا اثر یہ ہے کہ خاندانی رشتہ داری کے مقرر کیے ہوئے حقوق بھی ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ (ISLAM AT THE CROSS-ROAD) ۴۴

اس میں اضطراب اور بے چینی کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ والدین کا وہ عزت و احترام، بھائیوں سے محبت اور تعاون، اور وہ اخلاق حسنہ اور اوصاف حمیدہ، جو ماں کی آغوش میں اچھی تربیت پانے سے حاصل ہوتے ہیں، یکسر ناپید ہو گئے ہیں۔

مسلمان حق کے گواہ کی حیثیت سے | ملت اسلامیہ کا رفیع الشان قصر حق کی بنیاد پر اٹھایا گیا ہے۔ اس امت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ہر حال میں عدل و انصاف کی حفاظت و پاسبانی کرے اور اپنے اُس عہد و پیمان کو پوری طرح نبھائے جو اس نے کسی سے باندھا ہے۔ قرآن حکیم اسے نہایت واضح الفاظ میں حکم دیتا ہے کہ تم عدل کی راہ اختیار کرو۔ دیکھو تمہیں تمہاری خواہشات نفسانی کہیں راہ حق سے بھٹکا نہ دیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ۔

اے ایمان والو! خدا کے لیے انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں ناانصافی پر نہ اکسائے۔ انصاف کرو کہ انصاف تقویٰ سے قریب ہے اور خدا کی نافرمانی سے بچو۔ خدا تمہارے اعمال سے یقیناً آگاہ ہے۔

۴۴ "ہم کھانا اب ہوٹلوں اور رسٹیورانوں میں کھاتے ہیں۔ ہماری روٹی بیکری سے آتی ہے۔ کپڑے لانڈری میں دھلتے ہیں۔ پہلے وقتوں میں راحت و آرام کیلئے لوگ خاندانوں کی طرف رجوع کرتے تھے لیکن اب اس کے لیے سینماؤں، تھیٹروں اور کلبوں کا رُخ کیا جاتا ہے۔ پہلے خاندان ہماری دلچسپی کا مرکز تھا اور خاندانی زندگی ہی میں سکون تلاش کیا جاتا۔ مگر اب خاندان کے افراد بکھر گئے ہیں اور اگر کچھ مل کر بھی رہتے ہیں تو اس کا مقصد فوت ہو گیا ہے۔ وہ دن کا زیادہ وقت اکیلے فکر معاش میں بسر کرتے ہیں۔ رات کا وقت جس میں خاندان کے افراد اکٹھے ہوتے تھے وہ بھی اب علیحدگی میں گزرتا ہے۔ اب ہمارے گھر ہمارے لیے استراحت کی جگہ نہیں رہے جہاں ہم شب باش ہوں۔ شب باشی کا تو ذکر ہی کیا۔ اب تو ایک پوری رات بھی لوگ اپنے گھروں میں بسر کرنا پسند نہیں کرتے۔

(SOROKIN: THE CRISIS OF OUR AGE)

(مترجم)

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ـ

اے ایمان والو! انصاف پر مضبوطی سے جم جاؤ اور خدا لگتی گواہی دو۔ اگرچہ یہ گواہی تمہارے اپنے یا تمہارے ماں باپ اور قرابت داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

ایک مسلمان کو کسی کا حق مارنے اور کسی کا استخفاف کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اسی طرح اُسے اس بات کی بھی تلقین کی گئی ہے کہ وہ نہ تو افترا پردازی کرے اور نہ ہی کسی پر جھوٹا الزام لگائے۔ عورت پر اتہام باندھنے والے کو تو خاص سزا کا مستوجب ٹھہرایا گیا ہے۔ جو لوگ اس قسم کی حرکت کے مرتکب ہوتے ہیں اُن کا کوئی اعتماد باقی نہیں رہتا اور ساری عمر کے لیے اُن کی گواہی ناقابلِ قبول ہو جاتی ہے۔ یہ تہمت طرازی اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اُن کی ہوا و ہوس اُن کے دین و ایمان پر غالب ہے۔ وہ بغیر کسی دلیل کے نہایت سخت اور رسوا کن باتیں اپنے منہ سے نکال دیتے ہیں، لہٰذا وہ اس قابل ہیں کہ ان کے اقوال کی صداقت کو مشکوک سمجھا جائے اور ہر طرح کی شہادت میں اُن کی بات ساقط الاعتبار ٹھہرا دی جائے۔

تہذیبِ جدید اپنے ساتھ جو نئے افکار و تصورات لے کر آئی ہے اُن کی رُو سے جھوٹ اور افترا حیاتِ انسانی کے بالکل معمولات بن گئے ہیں۔ اب انسان کے اُن اوصاف کی تحسین و توصیف کی جاتی ہے جن سے فی الواقع وہ متصف نہیں ہوتا اور ایسے کارناموں پر قصیدے پڑھے جاتے ہیں جو اُس نے کبھی سرانجام نہ دیئے ہوں۔ ایک ہی قوم میں اخبارات نے اپنے دھڑے کی ہر جائز و ناجائز حمایت کو اپنا فرض منصبی قرار دیا ہے۔ پھر معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ انہیں اخبارات نے مختلف اقوام کے درمیان پھوٹ اور عداوت کے بیج بونے کے لیے کذب و دروغ کے ایسے نوادر پیش کیے جن کی نظیر نہیں ملتی۔ ایک قوم دوسری پر بالکل بے بنیاد الزام لگاتی ہے اور پروپیگنڈے کا یہ سارا طوفان اس شدت سے اٹھایا جاتا ہے کہ حق و باطل میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ گمراہی کی شاید ہی کوئی شاہراہ اب ایسی ہے جس پر ترقی کے اس دور میں افراد و اقوام گامزن نہ ہوں۔ اگر کسی شخص کو میری ان معروضات کے بارے میں شک ہے تو براہ کرم اس پراپیگنڈہ کا جائزہ لے جو ریڈیو پر دن رات نشر ہوتا رہتا ہے۔ یہ واویلا جو دنیا میں آج ہر سو پھیلا ہوا ہے، یہ مختلف دعاوی، یہ متناقض خبریں اور یہ گمراہ کن نظریات سب اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ حق اور انصاف

کی اب اہلِ دنیا کی نظر میں کوئی اہمیت اور وقعت باقی نہیں رہی اور حکومتوں، جماعتوں اور پارٹیوں نے اپنے ذاتی مفاد کے حصول کے لیے ہر قسم کے جھوٹ اور افترا کو بالکل جائز ٹھہرا دیا ہے۔ انہی مفادات کی خاطر لوگ ایک دوسرے پر اتہام باندھتے ہیں اور اسی غلط پروپیگنڈے کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے سے خائف بھی ہیں ہر گروہ دعویٰ یہی کرتا ہے کہ وہ دنیا میں خیر اور بھلائی چاہتا ہے، وہ عدل و انصاف کا علمبردار ہے، مگر ان کے یہ سب بلند بانگ دعاوی محض مکر و فریب ہیں۔ اسی طرح ہر جماعت ڈھنڈورا پیٹتی ہے کہ وہ فتنہ و فساد نہیں چاہتی، وہ جنگ و جدال کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ لیکن اُس کا طرزِ عمل اُس کے اس دعوے کی تائید نہیں کرتا۔

یہ ہیں وہ برائیاں جو اسلامی معاشرہ میں بگاڑ پیدا کرنے کے درپے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے مسلمان انہیں مہذب اور متمدن اقوام کے قابلِ رشک طور طریقے سمجھ رہا ہے۔ وہ انہیں تہذیبِ جدید کے لازمی تقاضوں کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ مسلمانوں کی اس سے زیادہ شامتِ اعمال اور کیا ہوگی کہ وہ ان کے فریب میں آجائیں۔ اگر تہذیبِ جدید کے یہ شر انگیز کارنامے انہیں اپنے دام میں پھنسالیں، اگر اس کی گمراہیاں انہیں راہِ حق سے بھٹکا دیں اور اگر اس کا شور شغب اُن کے کان بہرے کر دے تو اس سے زیادہ قابلِ افسوس بات ایک مسلمان کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

ایک مومن و مسلم کی زندگی کا تو اصل مقصد ہی یہی ہے کہ وہ اس دنیا میں حق و انصاف کا علمبردار ہو، وہ نہ تو کسی پر ظلم اور زیادتی کرے اور نہ ہی ہوا و ہوس کی پیروی کرے۔ وہ جھوٹ اور مکر و فریب سے بچتا رہے یہی ایک مسلمان کی اصل خصوصیات اور صفات ہیں اور اسلام انہیں دنیا میں فروغ دینا چاہتا ہے۔ ایک مسلمان کا حقیقی مقصد یہی ہونا چاہیے۔ اس لیے وہ جس وقت بھی یہ محسوس کرے کہ ان میں کمی آرہی ہے تو اس کمی کو پورا کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش کرتا ہے۔ اسلام معاشرہ کی تعمیر محبت اور تعاون کی بنیادوں پر کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دنیا میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہو۔ ہر فرد شریعت کے مطابق رزقِ حلال حاصل کر سکے۔ اس میں اگر کوئی فرد امیر ہو تو اسے اس امر کا پوری طرح احساس ہو کہ وہ تنہا اس دولت کا مالک نہیں، بلکہ اس میں ان لوگوں کا بھی حصہ ہے جو غریب اور نادار ہیں۔ یہ دولت تو ڈھلتی

چھاؤں ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ آج جو شخص فقیر و محتاج ہے وہ کل غنی اور مالدار ہو اور اس کے برعکس آج جو شخص دولت میں کھیلتا ہے وہ کل بالکل فاقہ مست اور قلاش بن جائے۔ اس بنا پر نہ تو اصحاب دولت و ثروت کو بخیل اور سنگ دل ہونا چاہیے اور نہ ہی غریب کو اپنے دل میں حسد و عداوت کے جذبات پالنے چاہئیں۔

شریعتِ اسلامی سب کی نگران ہے، وہ ہر شخص کے حقوق کی ضامن ہے اور ہر ایک پر ذمہ داریاں بھی عائد کرتی ہے۔ وہ امیروں سے مال لے کر اُسے اُن لوگوں تک پہنچاتی ہے جو اس سے محروم ہیں۔ اور اس طرح لوگوں کے درمیان اخوت و مودّت کے مقدّس رشتوں کو استوار کرتی ہے۔

اسلامی معاشرہ افراد کے مابین قرابت داری کے تعلقات کو مضبوط کرتا ہے۔ اس نے قرابت داروں کے حقوق کے معاملہ میں بڑی تاکید کی ہے اور صلۂ رحمی پر بڑا زور دیا ہے۔ پھر اسلام نے پڑوسیوں کے حقوق کی بھی نگہداشت کی ہے اور ہم پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ ہم اُن کی عزت و ناموس کی حفاظت کریں۔ اس کے بعد اسلام ہمیں اُس وسیع برادری کے حقوق کی طرف متوجہ کرتا ہے جس کے ہم سب ارکان ہیں۔

یہ ہیں وہ فرائض جن کی ادائیگی کی اسلام ہمیں تاکید کرتا ہے، جن کی بجا آوری کی وہ ہمیں ترغیب دلاتا ہے۔ مسلمان کی زندگی کا اصل مقصد یہی ہے کہ وہ ان ذمہ داریوں کو پورا کرے۔ آج اگر اسلامی معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہوگیا ہے، آج اگر اس میں ضعف و اضمحلال رونما ہوئے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے احکام شریعت کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔

جدید رجحانات اخلاقی اوصاف سے یکسر عاری ہیں۔ لوگ اس دَور میں صرف ایک ہی دھن میں لگے ہوئے ہیں اور وہ دولت سمیٹنے کی دھن ہے۔ وہی ان کی جدوجہد کا ہدف اور اُن کی سعی و عمل کا مقصود ہے۔ جو شخص بھی اس کے حصول کے لیے جائز راہوں کو مسدود پاتا ہے وہ بلاتامل حرام ذرائع کو اختیار کر لیتا ہے۔ اور جو اس مقصد میں ناکام ہوتا ہے وہ اپنے دل میں دولتمندوں کے خلاف نفرت و عداوت کی آگ بھڑکاتا ہے اور ان کے خلاف دولت ہی کی خاطر برسرِ پیکار ہوتا ہے۔ اس طرح سماج کے مختلف طبقے ایک دوسرے کے خلاف دست و گریباں ہوگئے ہیں۔ دولت پرستی کے اس اندھے جذبے نے روحانی اقدار اور انسانیت کے بلند مقاصد کو بالکل بے وقعت اور بے معنی بنا دیا ہے۔ جس نسبت سے لوگوں کی حرص بڑھتی ہے

اسی شدت اور غیظ و غضب کے ساتھ وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں۔ عہد حاضر میں جو پیہم جنگ و جدال، فتنہ و فساد ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں وہ سب اسی حرص کے نتائج بد ہیں۔ ہمارے اس دور میں ایک شخص کو اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ اُس کی عزت و آبرو باقی ہے یا نہیں، اُس کی آزادی محفوظ ہے یا سلب ہو چکی ہے، وہ اپنی رائے کا مختار ہے یا دوسروں کے ہاتھوں میں محض کٹھ پتلی بن کر رہ گیا ہے۔ اُسے اگر کوئی فکر دامن گیر ہے تو صرف ایک کہ وہ پانی اور چارے میں دوسروں کے برابر کا حصہ دار ہو۔ لوگوں کے مصائب و آلام کی مدت بہت طویل ہو گئی ہے۔ لوگوں سے جو وعدے کیے گئے تھے وہ ابھی تک وعدے ہی ہیں، شرمندۂ تعبیر نہیں ہوئے۔ انہیں آج تک وہ چیز نہیں مل سکی جو انہیں سکون و اطمینان بخش دے۔ یہ دشمنی، یہ بغض و عناد، یہ ظلم و عدوان، یہ جبر و اکراہ اور انسانی اخلاق کے نوامیس عالیہ سے یہ تہی دامنی ۔۔ یہ ہیں وہ اسباب جن کی بنا پر امتِ مسلمہ تہذیب جدید کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری خواہش کے علی الرغم یہ برائیاں اسلامی معاشرہ کے رگ و پے میں سرایت کرتی جا رہی ہیں۔ ہم اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ کہیں یہ خرابیاں اسلامی معاشرہ کے رگ و پے میں سرایت نہ کر جائیں ۔ ہم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ خرابیاں ہمارے سماج میں مستقل طور پر جڑ نہ پکڑ لیں اور دنیائے مغرب کی طرح کہیں ہمیں بھی اُن زندگی بخش اقدار اور نیک مقاصد سے ہٹا نہ دیں جو ہمارا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ اور اس طرح ہم شقاوت و بدبختی کے عمیق غاروں میں دھکیل دیئے جائیں۔

اسلام اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے بھائی بھائی بنیں۔ حق و انصاف کے نفاذ کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔ جو کچھ مل جائے اُسی پر مطمئن ہوں اور جو نہ مل سکے اُس کی اُمید سے معمور رہیں۔ لیکن اس کی طلب میں نہ تو زیادتی کریں اور نہ ہی راہِ راست سے بھٹکنے پائیں۔ اپنے بھائیوں کے لیے جانی اور مالی ایثار کرنے سے قطعاً گریز نہ کریں۔ اگر ان پر کوئی مصیبت آ پڑے تو اُن کی دستگیری میں ہمیں کسی قسم کا تامل نہ ہو۔ رنج و محن، راحت و آرام، ہر حالت میں اُن کا ساتھ دیں۔ ہمیں ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو ذیل کی آیت کی مصداق ہو۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ   بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ انصاف اور حسن سلوک

وَ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَ یَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ وَ الْبَغْیِ ۔ | اور قرابت داروں کی خدمت کرنے کا حکم دیتا ہے ۔ وہ بے حیائی بے ہودگی اور ظلم و زیادتی سے منع فرماتا ہے ۔

اس جماعت کا شعار یہ ہو :

لا یومنُ احدکم حتیٰ یحبَّ لاخیہ ما یحبُّ لنفسہ ۔ | تم میں سے کوئی صحیح معنوں میں مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہ کچھ پسند کرتا جو وہ اپنے لیے کرتا ہے ۔

آج کی تہذیب پر مادیت غالب اور مسلط ہے ، محسوسات اس کا احاطہ کیے ہوئے ہیں ۔ اور حرص و ہوا کے بندھنوں نے اسے بُری طرح جکڑ رکھا ہے ۔ آج دنیاوی فوائد و لذائذ کی پرستش کی جا رہی ہے ۔ انسان کے اندر اب یہ احساس پوری طرح پرورش پا چکا ہے کہ حیاتِ انسانی کام و دہن کی لذّت کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ۔ وہ جو کچھ کماتا ہے وہی اُس کی زندگی کا گوہر مراد ہے ۔ اس طرزِ تفکر نے اب یہاں تک ترقی کی ہے کہ ایک انسان کو ایک ایسا حیوان قرار دیا ہے جس کا مقصد بجز پیٹ بھرنے کے اور کوئی نہیں جس نے نہ تو کبھی اس سطح سے بلند ہو کر سوچا ہے اور نہ ہی اس دائرہ سے باہر قدم رکھنے کی کوشش کی ہے ۔

تہذیبِ جدید کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اکل و شرب ، لباس اور اسی قسم کی دوسری جسمانی اور مادی ضروریات کے علاوہ ہر رابطہ کو توڑ دیں ۔ اس کے علاوہ یہ تہذیب یہ بھی چاہتی ہے کہ ہر اُس چیز کا انکار کر دیں جو غیر مرئی ہے ، نہ تو خدا کی خدائی کو تسلیم کریں اور نہ دین کی فرمانروائی کو ۔ یہ تہذیب ہم پر یہ بھی لازم ٹھہراتی ہے کہ ہم اُن تمام انسانی اقدار کو ترک کر دیں جن میں حیوانیت شریک نہ ہو ۔ اس لحاظ سے انسان میں نہ تو کوئی آگہی اور وقوف ہونا چاہیے ، نہ ہی ارادہ و اختیار اور نہ ہی اخلاق و شرافت ۔ اس نئے انسان کو چاہیے کہ وہ شفقت ، مودت ، صلہ رحمی اور اسی قبیل کی تمام باتوں کا مذاق اڑائے ۔ یہ جدید انسان جب تمام ادیان کا انکار اور تمام انسانی فضائل سے اعراض کر چکتا ہے تو اُسے اکل و شرب میں شرکت کا حق بخشا جاتا ہے ، یا یوں کہنا چاہیے کہ اُسے چارہ اور پانی نصیب ہوتا ہے ۔ نہیں ، بلکہ وہ صرف اس بات کا مستحق سمجھا جاتا ہے کہ اُسے آب و دانہ کی فراہمی کا وعدہ دلا کر ہانکا جائے خواہ یہ وعدہ وفا ہو یا نہ ہو ۔

یہ ہے تمہاری تہذیب نَو اور یہ ہے مادیت اپنی آخری اور جدید ترین شکل میں۔

مسلمانوں کو اس تہذیب سے بچنا چاہیے اور اس امر کے لیے کوشاں رہنا چاہیے کہ اس سے کسی طرح نجات پائیں۔ اُن کے دین و ایمان نے اخلاق و مروّت اور عدل و انصاف کی جو بلند اقدار انہیں دی ہیں، انہیں انہی کو اپنانا چاہیے، اگرچہ اہلِ دنیا کی بیشتر تعداد اس دور میں ان حقائق کو جھٹلا رہی ہے۔

مسلمانو! فتنہ اور فساد کی اس خبگاہ میں تمہیں صبر و ثبات سے کام لینا چاہیے۔ تمہیں اپنے اندر اعتماد پیدا کر کے اپنے دین و ایمان اور درخشاں ماضی کی طرف رجوع کرنا چاہیے، تاکہ تم انسانیت کو اُس عظیم شر سے جو اُس کے اردگرد چاروں طرف پھیلا ہوا ہے نجات دلا سکو اور نوعِ بشری کو تاریکی اور اندھیرے سے نکال کر روشنی اور نور میں لے آؤ۔

تمہارے شایانِ شان یہی چیز ہے کہ تم پوری انسانی برادری کو اخوت اور انصاف کی طرف بلاؤ، لوگوں کو دین و ایمان، نیکی اور بھلائی کی دعوت دو اور تم اُس فرض کو احسن طریق سے سرانجام دو جس کی قرآن نشاندہی کرتا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ	تم ایک بہترین امّت ہو جو تمام انسانوں کی خاطر بنائی گئی ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو برائی سے منع کرتے ہو، اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔